محمد حنیف شاہد ایم۔اے

علامہ اقبالؒ کا نظریۂ تعلیم

علامہ اقبالؒ ایک انقلابی مفکر تھے۔ وہ فنِ تعلیم کے ماہر نہ تھے نہ انہوں نے اس موضوع پر کوئی خاص کتاب تحریر فرمائی، مگر تعلیم سے اُن کی دلچسپی زندگی کے ہر مرحلے پر برابر قائم رہی کبھی براہِ راست مُعلّم کی حیثیت سے اور کبھی مروّجہ نظامِ تعلیم کے نقاد اور مصلح کی حیثیت سے۔ وہ ایک عرصہ تک اورنٹیل کالج لاہور، گورنمنٹ کالج لاہور اور اسلامیہ کالج لاہور میں درس دیتے رہے۔ ایم۔اے میں کامیابی کے بعد علامہ اقبالؒ ۱۳ مئی ۱۸۹۹ء کو اورنٹیل کالج لاہور میں میکلوڈ عربک ریڈر کی حیثیت سے متعین ہوئے اور وہ یہ خدمت مئی ۱۹۰۳ء تک انجام دیتے رہے[1] میکلوڈ عربک ریڈر کے عہدے سے سبکدوش ہونے کے بعد علامہ اقبالؒ ۳ جون ۱۹۰۳ء کو گورنمنٹ کالج لاہور میں اسسٹنٹ پروفیسر فلسفہ کی حیثیت سے ملازم ہو گئے اور تقریباً دو برس تک اس منصب پر فائز رہے[2]

اسلامیہ کالج لاہور سے اوّلین تعلق کے بارے میں خلیفہ شجاع الدین اپنے مقالے " اقبال انجمن کے جلسوں میں[3]" میں یوں رقم طراز ہیں:

"اول الذکر اجلاس (۱۸۹۹ء) کے تھوڑے عرصہ بعد اقبالؒ کے لیے انجمن سے وابستگی کا ایک اور موقع نکل آیا۔ شیخ عبدالقادر ان دنوں اخبار " آبزرور " کے ایڈیٹر اور اسلامیہ کالج میں ادبیات انگریزی کے پروفیسر تھے۔ انہیں چند روز کی رخصت لینی پڑی تو ان کی جگہ اقبال مرحوم یہ فرائض انجام

---

[1] " اقبال اورنٹیل کالج میں " از ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار رسالہ اقبال، اپریل ۱۹۶۲ء

[2] ہسٹری آف دی گورنمنٹ کالج لاہور از ایچ ایل او گیرٹ۔

[3] حمایت اسلام شجاع الدین نمبر جلد ۳۳ نمبر ۱۵ و ۱۶ - ۴ مئی ۱۹۵۴ء

دیتے رہے۔ مَیں ان دنوں ایف۔اے کا طالب علم تھا۔ نصاب میں "متلاشیانِ حق" کے نام سے ایک کتاب شامل تھی جس میں زمانۂ قبل از مسیح کے تین حکماء کی سرگزشتیں درج تھیں۔ عیسائی مصنف نے ان "متلاشیانِ حق" کے بعض اقوال کا موازنہ انجیل کی آیات سے کیا لیکن علّامہ مرحوم نے کلامِ پاک کی ان آیات سے ان اقوال کی تشریح کی جو ان کے ساتھ مطابقت رکھتی تھیں۔ موازنہ کے دوران میں آپ یہ بھی ثابت کرتے جاتے تھے کہ قرآن کی آیات ان اقوال سے بدرجہا افضل اور بہر نوع اکمل ہیں۔ اسلامیہ کالج کی چند روزہ پروفیسری نے ہی آپ کے تبحرِ علمی کا سکہ بٹھا دیا۔"

اسلامیہ کالج کی ملازمت کے سلسلے میں علّامہ اقبال کا اپنا ایک خط موجود ہے جس میں اکبر الٰہ آبادی کو تحریر فرماتے ہیں :

"جواب دینے میں تاخیر ہوئی جس کے لیے معافی چاہتا ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ آج کل معمول سے زیادہ مصروفیت ہے۔ اسلامیہ کالج لاہور کے پروفیسر ڈاکٹر ہیگ چیچک کی بیماری سے دفعتہً انتقال کر گئے اور انجمن حمایت اسلام لاہور کے اصرار پر دو ماہ کے لیے کالج کی ایم۔اے کی جماعت مجھ کو لینی پڑی۔ امید ہے دو ماہ تک نیا پروفیسر مل جائے گا۔ یہ لڑکے شام کو ہر روز میرے مکان پر آجاتے ہیں۔ دن میں جو تھوڑی بہت فرصت ہوتی ہے اس میں ان کے لیکچر کے لیے کتب دیکھتا ہوں لیکچر کیا ان کی ذہنی مایوسیوں اور ناکامیوں کا افسانہ ہے جسے عرفِ عام میں تاریخِ فلسفہ کہتے ہیں۔ ابھی کل شام ہی مَیں ان کو آپ کا یہ شعر سنا رہا تھا ؎

مَیں طاقتِ ذہن غیر محدود جانتا تھا خبر نہیں تھی
کہ ہوش مجھ کو ملا ہے تُل کر، نظر مجھے مل گئی ہے نپ کر

سُبحان اللہ! کیا خوب کہا ہے۔ جزاک اللہ!

بہر حال ان لیکچروں کے بہانے سے ان لڑکوں کے کان میں کوئی نہ کوئی مذہبی نکتہ ڈالنے کا موقع مل جاتا ہے۔ ع

جان حاضر ہے مگر راہِ خدا ملتی نہیں

لہ اقبال نامہ جلد دوم از شیخ عطا اللہ صفحہ ۴۷

تعلیمی پیشے سے عملی وابستگی کے علاوہ علّامہ اقبالؒ نے اسلامی معاشرت کی تشکیلِ جدید کے ضمن میں نئے نظامِ تعلیم کے خدوخال کو بھی اُجاگر کیا ہے۔ علّامہ اقبال اپنے نظریہ تعلیم کی ابتدا "بچہ" کی ابتدائی زندگی سے شروع کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ مندرجہ ذیل امُور پر زور دیتے ہیں۔

۱۔ بچّے کے بزرگ
۲۔ بچّے کی وراثت
۳۔ بچّے کی جبلّی صلاحیّتیں
۴۔ بچّے کے فطری میلانات
۵۔ بچّے کی تربیت ۔

جب بچہ آغوشِ مادر سے نکل کر گھریلو تعلیم سے آشنا ہوتا ہے تو اس میں حسبِ ذیل جذبات پیدا کرنے کی طرف توجہ دلاتے ہیں:

۱۔ بچّے کے جذبات اولوالعزمی وخودنمائی۔
۲۔ وطن سے محبت
۳۔ بزرگوں کا احترام
۴۔ قوم سے محبت
۵۔ علم سے لگاؤ

"بچّوں کی تعلیم وتربیت" کے عنوان سے علّامہ اقبالؒ نے ایک مضمون لکھا جو ماہنامہ مخزن بابت جنوری ۱۹۰۲ء کی زینت بنا۔ بچّوں کی تعلیم وتربیت کے بنیادی نکات پر زور دیتے ہوئے آپ نے تحریر فرمایا:

"پڑھے ہوئے شاگردوں کو پڑھانا ایک آسان کام ہے مگر انجان بچّوں کی تعلیم ایک ایسا دشوار امر ہے کہ ہمارے ملک کے معلّم اس کی دقّتوں سے ابھی پُورے طور پر آشنا نہیں۔ ہمارا پُرانا طریقۂ تعلیم چونکہ بچّوں کے قوائے عقلیہ اور واہمہ کے مدارجِ نمو کو ملحوظ نہیں رکھتا اس واسطے اس کا نتیجہ ان کے حق میں نہایت مضر ثابت ہوتا ہے۔ ان کے قوائے ذہنیہ برباد ہو جاتے ہیں اور ان کے چہروں پر ذکاوت کی وہ چمک نظر نہیں آتی جو اس بے فکری کی زندگی کے ساتھ مختص ہے۔ بڑی عمر میں یہ تعلیمی

نفص اور بھی وضاحت سے دکھائی دیتا ہے۔ روزمرّہ کے معاملات کا سمجھنا اور ان کی پیچیدگیوں کو سلجھانا جو ایک عملی طبیعت کے آدمی کے لیے نہایت ضروری اوصاف ہیں ان میں سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتے۔ ان کی زندگی ناکامیوں کا ایک افسوسناک سلسلہ ہوتی ہے اور سوسائٹی کے لیے ان کا وجود محض معطّل ہو جاتا ہے۔

سچ پوچھیے تو تمام قومی عروج کی جڑ بچّوں کی تعلیم ہے۔ اگر طریق تعلیم علمی اصُولوں پر مبنی ہو تو تھوڑے ہی عرصہ میں تمام تمدّنی شکایات کافور ہو جائیں اور دنیوی زندگی ایک ایسا دل فریب نظارہ معلوم ہو کہ اس کے ظاہری حسن کو مطعون کرنے والے فلسفی بھی اس کی خوبیوں کے ثناخواں بن جائیں۔ انسان کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ دنیا کے لیے اس کا وجود زینت کا باعث ہو اور جیسا کہ ایک یونانی شاعر کہتا ہے اس کے ہر فعل میں ایک قسم کی روشنی ہو جس کی کرنیں اوروں پر پڑ کے ان کو دیانت داری اور صلح کاری کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا سبق دیں۔ اس کی ہمدردی کا دائرہ دن بدن وسیع ہونا چاہیے تاکہ اس کے قلب میں وہ وسعت پیدا ہو جو روح کے آئینہ سے تعصبات اور توہمات کے زنگ کو دُور کر کے اسے مُجلّا و مُصفّا کر دیتی ہے۔ . . . . حقیقی انسانیت یہ ہے کہ انسان کو اپنے فرائض سے پُوری پُوری آگاہی ہو اور وہ اپنے آپ کو اس عظیم الشان درخت کی ایک شاخ محسوس کرے جس کی جڑ تو زمین میں ہے مگر اس کی شاخیں آسمان کے دامن کو چھُوتی ہیں۔ اس قسم کا کامل انسان بننے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہر انسانی بچّے کی تربیت میں یہ غرض ملحوظ رکھی جائے کیونکہ یہ کمال اخلاقی تعلیم اور تربیت ہی کی وساطت سے حاصل ہو سکتا ہے جو لوگ بچّوں کی تعلیم و تربیت کے صحیح اور علمی اصُول کو مدّنظر نہیں رکھتے وہ اپنی نادانی سے سوسائٹی کے حقوق پر ایک ظالمانہ دست درازی کرتے ہیں جس کا نتیجہ تمام افراد سوسائٹی کے لیے انتہا درجہ مضر ہوتا ہے۔

اس مضمون کی تحریر سے ہماری یہ غرض ہے کہ علمی اصولوں کی رُو سے بچپن کا مطالعہ کر کے یہ معلوم کریں کہ بچّوں میں کون کون سے قوا کا ظہور پہلے ہوتا ہے اور ان کی تعلیم و تربیت کس طرح ہونا چاہیے۔ ہم ایک ایسا طریق پیش کرنا چاہتے ہیں جو محض خیالی نہیں ہے بلکہ ایک قابلِ عمل طریق ہے جس سے بچّوں کی تعلیم کے لیے ایسے آسان اور صریح اصول ہاتھ آجاتے ہیں جن کو معمولی سمجھ کا آدمی سمجھ سکتا ہے اور ان کے نتائج سے مستفید ہو سکتا ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ناظرین ان سے فائدہ

اُٹھائیں گے اور اپنے بچّوں کی ابتدائی تعلیم میں ان اصُولوں کو ملحوظِ خاطر رکھیں گے کیونکہ ؎

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج
تا ثریّا می رود دیوار کج

سب سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ وہ کون سے امُور ہیں جو عالمِ طفلی کے ساتھ مختص ہیں تاکہ بچّوں کی تعلیم و تربیت میں ان کو ملحوظ رکھا جائے اور ان سے باحسن وجوہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جائے۔"

اس کے بعد علّامہ اقبالؒ وہ امور پیش کرتے ہیں اور ان کو مزید ذہن نشین کرانے کے لیے بعض دلچسپ مثالیں دیتے ہیں۔

(۱) "اس ضمن میں پہلی بات جو ہر مطالعہ کرنے والے کو صاف دکھائی دیتی ہے یہ ہے کہ بچّوں میں ایک قسم کی اضطراری حرکت کا میلان ہوتا ہے جو نہ صرف انسان کے ساتھ ہی خاص ہے بلکہ ہر حیوان میں پائی جاتی ہے۔ دیکھیے بلّی کا بچہ کیا مزے سے خود بخود کھیلتا ہے۔ چھوٹے کتّے کی زنجیر کھول دو تو اضطراری حرکت کی خوشی میں پھُولا نہیں سماتا۔ بچّوں میں اعصابی قوت کی ایک زائد مقدار ہوتی ہے جو کسی نہ کسی راہ سے صرف ہو کر ان کی خوشی کا موجب ٹھہرتی ہے۔ بعض دفعہ اعصابی قوت کی یہ زائد مقدار رونے چلّانے میں صرف ہو جاتی ہے، بعض دفعہ بے تحاشا ہنسنے اور کھیلنے کوُدنے میں۔ پس جو لوگ بچّوں کے رونے سے تنگ آتے ہیں ان کو یاد رہے کہ یہ بھی ان کے جسمانی اور روحانی نمو کے لیے ایک ضروری جزو ہے . . . حقیقت یہ ہے کہ بچّہ ایک متعلّم ہستی نہیں بلکہ سراپا ایک متحرک ہستی ہے جس کی ہر طفلانہ حرکت سے کوئی نہ کوئی تعلیمی فائدہ اٹھانا چاہیے۔ مثلاً اینٹوں کے گھر بنانا، لڑی میں منکے پرونا وغیرہ۔

(۲) بچپن کا ایک اور خاصہ یہ ہے کہ اس عمر میں کسی شے پر مسلسل توجہ نہیں ہو سکتی۔ جس طرح اس کے جسمانی قویٰ کو ایک جگہ قرار نہیں ہو سکتا اسی طرح اس کے قوائے عقلیہ بھی ایک نقطہ پر عرصہ کے لیے قرار پذیر نہیں رہ سکتے، جس طرح ہاتھ نچلّے نہیں رہ سکتے اسی طرح اس کی توجہ میں بھی ایک طرح کی بے قراری ہے جو اسے ایک مقام پر جمنے نہیں دیتی، لہٰذا ہر طریقِ تعلیم میں اس بات کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ سبق طویل نہ ہوں اور چھوٹے چھوٹے حصّوں پر منقسم ہوں تاکہ پڑھتے

وقت بچّے کے مختلف قویٰ کو تحریک ہو۔ اس کے علاوہ یہ بھی لازم ہے کہ ہر سبق میں ایک خاص مشترک بات ہو تاکہ ایک خاص مقام پر توجہ لگانے کی عادت بھی ترقی کرتی جائے۔

(۳) بچوں کو اشیاء کے غور سے دیکھنے اور بالخصوص ان کے چھونے میں لطف آتا ہے۔ تین مہینے کی عمر کا بچہ ہو اور اس کی توجہ روشنی کی طرف منتقل ہو جائے تو ہاتھ پھیلاتا ہے اور شمع کے شعلے کو پکڑنے کی کوشش کرتا ہے ـــــ نظر کے فعل سے اس کی تسلّی نہیں ہوتی، حسِ لامسہ سے بھی مدد طلب کرتا ہے کیونکہ اسے قدرتاً اشیاءِ خارجی کے چھونے میں مزا آتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ پس جس شے کے متعلق سبق دو اس کو بچے کے سامنے رکھو اور جب سبق ختم ہو جائے تو شئے مذکور اس کے ہاتھ میں دے دو۔ مشاہدہ سے حسِ بصر کی تربیت ہوتی ہے، چھونے سے قوتِ لمس معتدبہ فروغ پاتی ہے گفتگو اور راگ وغیرہ سے قوتِ سامعہ ترقی کرتی ہے۔ اس طرح لمس اور بصر کے متحدہ استعمال سے بچہ کو صورتِ شئے کا ادراک ہوتا جائے گا۔

(۴) بچے کی توجہ صورتِ شئے سے زیادہ رنگِ شئے کی طرف لگتی ہے۔ جن اشیاء کا رنگ شوخ ہو اس کا دھیان زیادہ تر انہی کی طرف رہتا ہے۔ کسی اعلیٰ درجے کے مصوّر کی بنائی ہوئی تصویر اس کے سامنے رکھ دو، اگر اس کا رنگ شوخ اور چمکیلا نہیں تو اسے اس کی پروا بھی نہیں ہوگی، برخلاف اس کے اپنی چھوٹی سی کتاب کی رنگین تصویروں پر جان دیتا ہے۔ بول چال میں ملاحظہ کیجیے۔ لفظ سرخ، نیلا وغیرہ تو پہلے سیکھ جاتا ہے اور لفظ مربع اور مکون وغیرہ کہیں بعد میں جا کر۔ اس سے یہ اصول قائم ہوا کہ بچے کے ابتدائی سبق رنگین اشیاء کے متعلق ہونے چاہییں۔

(۵) بچّے میں بڑوں کی نقل کرنے کا مادّہ خصوصیت سے زیادہ ہوتا ہے۔ ماں ہنستی ہے تو خود بھی بے اختیار ہنس پڑتا ہے۔ باپ کوئی لفظ بولے تو اس کی آواز کی نقل اُتارے بغیر نہیں رہتا۔ ذرا بڑا ہوتا ہے اور کچھ باتیں بھی سیکھ جاتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اس وقت بڑا ضروری ہے کہ استاد اپنی مثال بچے کے سامنے پیش کرے تاکہ اسے اس کے ہر فعل کی نقل کرنے کی تحریک ہو۔

(۶) قوتِ متخیلہ یا واہمہ بھی بچوں میں بڑی نمایاں ہوتی ہے۔ شام ہوئی اور لگا ستانے اپنی ماں کو "اماں جان! کوئی کہانی تو کہہ دو۔" ماں چڑیا یا کوّے کی کہانی سناتی ہے تو خوشی کے مارے لوٹ جاتا ہے۔ ذرا بڑا ہوا اور پڑھنا سیکھ گیا تو ناولوں اور افسانوں کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ استاد کو

چاہیے کہ قوتِ واہمہ کی نمو کی طرف بالخصوص خیال رکھے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ قوت بے قاعدہ طور پر بڑھ جاتے اور اس سے قوائے عقلیہ کی ترقی میں نقص پیدا ہو۔ ۔ ۔ ۔ اکثر مکتبوں میں لڑکے کاغذ کی کشتیاں دن رات بنایا کرتے ہیں۔ قوتِ واہمہ کے لیے یہ اچھی مشق ہے۔

(۷) بچوں میں ہمدردی کی علامات بھی ظاہر ہوتی ہیں جن سے بچے کی اخلاقی تعلیم میں ایک نمایاں فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ تجربہ اور مشق سے یہ جبلی قوت بڑھتی جاتی ہے۔ ابتداء میں آوروں کے غم سے متاثر ہونا معلوم ہوتا ہے۔ اُستاد کو چاہیے کہ اسے ہمدردی کے متعلق عمدہ عمدہ کہانیاں سنائے اور یاد کرائے جس حیوان کے متعلق اسے سبق دینا ہو اس کے ساتھ اچھا سلوک کرے تاکہ بچے کے لیے ایک عمدہ مثال تقلید کرنے کے لیے قائم ہو جائے۔

(۸) الفاظ یاد رکھنے کے لیے بچہ کا حافظہ حیرت ناک ہے۔ اپنی مادری زبان کی پیچیدگیاں کس آسانی سے سیکھ جاتا ہے اور یاد کر لیتا ہے۔ مُعلّم کو لازم ہے کہ اپنے شاگردوں کو عمدہ عمدہ اشعار اور نظمیں یاد کرائے اور پڑھے ہوئے سبقوں کے مضامین کی طرف بار بار اشارہ کرے۔

(۹) اس عمر میں قوتِ متمیزہ کمزور رہتی ہے۔ اشیاء کے باریک باریک فرق تو معلوم نہیں کر سکتا۔ ہاں بڑے ظاہر اور نمایاں اختلافات، مثلاً اختلافات صور اشیاء معلوم کر لیتا ہے لہذا ابتدا میں ظاہر اختلافات کی طرف اسے توجہ دلانی چاہیے۔ مثلاً دو چیزیں ایک گیند اور ایک پہلودار شے اس کے سامنے رکھ دو اور دونوں کے اختلافات مندرجۂ ذیل طور سے بیان کرو۔

گیند	پہلودار شے
ایک ہی سطح ہے	بہت سی سطحیں ہیں
کوئی کنارہ نہیں	بہت سے کنارے ہیں

(۱۰) قوائے عقلیہ مثلاً تصدیق اور استدلال کا کمزور رہنا: بچّہ سے ایسی فہمید کی توقع نہ رکھو جو ابھی تجربے اور علم سے بڑھنی ہے۔ ان قُویٰ کے مدارج ترقی کا لحاظ استاد کے لیے نہایت ضروری ہے۔ ۔ ۔ ۔ ایک برس کے بچے کو کیا معلوم کہ "حُبِّ وطن" کس جانور کا نام ہے۔ ہمارے بعض مُعلّم بچہ کے ہاتھوں میں ایسی ابتدائی کتابیں رکھ دیتے ہیں جن کا پہلا باب "خدا کی صفات" سے شروع ہوتا ہے مگر انہیں یہ معلوم نہیں کہ خدا ایک مجرّد تصور ہے جو قوائے عقلیہ کے حدِ کمال

پر پہنچنے اور بہت سا علم حاصل کرنے کے بعد حاصل ہوتا ہے اور صفاتِ شئے کا اس شئے سے علیحدہ تصوّر کرنا ایک ایسا فعل ہے جو بچے سے کسی صورت میں ممکن نہیں ہے۔ علمی اصولوں کی رُو سے بچے کے حافظے پر ایک بے جا اور غیر مفید بوجھ ڈالنا اچھا نہیں ہے.... اُستاد کو خیال رکھنا چاہیے کہ بچے کے مدرکات، تصوّرات، تصدیقات اور استدلالات اس کے علم کے اندازے کے ساتھ ساتھ ترقی کرتے جائیں۔

(۱۱) آخری خاصہ بچے کا یہ ہے کہ اخلاقی محرکات سے یا تو بچہ متاثر ہی نہیں ہوتا، یا اگر ہوتا ہے تو نہایت اقل درجہ پر، کیونکہ اس قسم کی تحریکوں سے متاثر ہونا اور اس اثر کو عملی زندگی کے دائرہ میں ظاہر کرنا ایک ایسا امر ہے کہ جو اعلیٰ درجہ کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہے۔ معلّموں کا فرض ہے کہ ابتداء ہی سے بچے میں اخلاقی تحریکوں سے متاثر ہونے کی قابلیت پیدا کرنے کی کوشش کریں۔

مندرجہ بالا سطور سے واضح ہو گیا ہو گا کہ ایک عمدہ اور مضبوط تعلیمی بنیاد رکھنے کے لیے بچے کے نشوونما کا مطالعہ کہاں تک ضروری ہے۔ معلّم حقیقت میں قوم کے محافظ ہیں کیونکہ آئندہ نسلوں کو سنوارنا اور ان کو ملک کی خدمت کے قابل بنانا انہیں کی قدرت میں ہے۔ سب محنتوں سے اعلیٰ درجے کی محنت اور سب کارگزاریوں سے زیادہ بیش قیمت کارگزاری ملک کے معلّموں کی کارگزاری ہے.... معلّم کا فرض تمام فرضوں سے زیادہ مشکل اور اہم ہے کیونکہ تمام قسم کی اخلاقی، تمدنی اور مذہبی نیکیوں کی کلید اسی کے ہاتھ میں ہے اور تمام قسم کی ملکی ترقی کا سرچشمہ اسی کی محنت ہے۔ پس تعلیم پیشہ اصحاب کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے پیشہ کے تقدس اور بزرگی کے لحاظ سے اپنے طریقِ تعلیم کو اعلیٰ درجہ کے علمی اصولوں پر قائم کریں[۵]۔"

علامہ اقبالؒ کو مسلمانوں کے تعلیمی مسائل سے بھی بڑی دلچسپی تھی اور انہیں حل کرنے کے لیے نہ صرف ان پر غور و فکر کرتے رہتے بلکہ وقتاً فوقتاً عملی اقدام بھی کرتے۔ اسی سلسلے میں ۱۹۱۱ء میں ایک انجمن پنجاب پروونشل ایجوکیشنل کانفرنس قائم ہوئی۔ اس کا پہلا اجلاس ۱۵ اپریل ۱۹۱۱ء کو ہوا۔ علامہ

---

[۵] اقبال نامہ (حصہ اول)، از شیخ عطاء اللہ صفحہ ۳۱۳

اقبال اس کے سکرٹری مقرر ہوئے۔ اجلاس کی کارروائی علامہ اقبالؒ کے دستخطوں سے شائع ہوئی۔ اس اجلاس میں مندرجہ ذیل قراردادیں منظور کی گئیں۔

(۱) اس کانفرنس کی رائے میں اُردو رسم الخط کا متداول رہنا صوبہ پنجاب کی عام علمی اور تمدنی ترقی کے لیے ازبس ضروری ہے اور اس کے موجودہ عالم گیر استعمال میں کسی قسم کی مداخلت کرنا صوبہ پنجاب کی علمی اور تمدنی ترقی کو سالہا سال پیچھے ڈال دے گا۔

(۲) اس کانفرنس کی رائے میں صُوبہ پنجاب کے بالعموم اور مسلمانوں کے بالخصوص علمی اغراض اس امر کے متقاضی ہیں کہ اردُو زبان کو ہی صوبہ پنجاب کے مدارس میں واحد ذریعۂ تعلیم رہنے دیا جائے۔

(۳) یہ کانفرنس زبان فارسی کو نصاب تعلیم صوبۂ پنجاب سے عملاً کم اور خارج کر دینے کی تجویز کو تعلیمی نقطۂ خیال سے بالخصوص مسلمانان پنجاب کی علمی اور عام اغراض کے حق میں مضر اور بالعموم غلط تجویز تصور کرتی ہے۔

(۴) اس کانفرنس کی رائے میں نظر بحالاتِ موجودہ اکثر گورنمنٹ اسکولوں میں غیر مسلم اُستادوں کی کثرت ہے۔ محکمہ تعلیم کا اسکولوں میں داخلہ طلبہ کی تعداد محدود کرنا اکثر مستحق مسلم طلباء کے حق میں مضر ہو گا۔

(۵) مسلمانانِ پنجاب کی تاحال غیر مکتفی تعلیمی حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے اور اس امر کا بھی احساس رکھتے ہوئے کہ ابھی تک گورنمنٹ کی طرف سے حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے۔ یہ کانفرنس وکٹوریہ وظائف میں سے جو صرف مسلمانوں کی تعلیمی کمی کو پُورا کرنے کے لیے جاری کیے گئے تھے غیر مسلم اقوام کو حصہ دینا مسلمانوں کے تعلیمی اغراض کے لیے نہایت مضر سمجھتی ہے اور درخواست کرتی ہے کہ تعداد وظائف میں جو مسلمانوں کے لیے مقرر ہوئی تھی کسی طرح کمی نہ کی جائے۔

(۶) اس کانفرنس کی رائے میں اب وقت آگیا ہے کہ مسلمانانِ پنجاب کو صنعتی، حرفتی اور تجارتی تعلیم دینے کا انتظام کیا جائے اور اس میں کسی قسم کی تاخیر بھی اب مسلمانوں کی اغراض کے لیے سخت مضر ہے۔

(۷) اس کانفرنس کی رائے میں لوئر اور اپر پرائمری اسکولوں میں ٹرینڈ اساتذہ کی کمی کو پورا کرنے کے لیے مسلمانوں کو ایک اپنا نارمل اسکول جاری کرنا نہایت ضروری ہے۔

(۸) اس کانفرنس کی رائے میں مسلمانانِ پنجاب کی تعلیمی توسیع کے لیے دیسی مکاتب کی تجدید و ترویج

از حد ضروری ہے خاص کر اس لیے کہ اسی محکمہ تعلیم کی وساطت سے غریب مسلمان طلبا کی دینی اور دنیوی تعلیم کی توسیع ہو۔

علامہ اقبالؒ مسلمانوں کی حالتِ زار دیکھ کر کڑھتے تھے۔ وہ نظامِ تعلیم میں ایک زبردست انقلاب کے خواہاں تھے، ان سے جیسے بھی بن پڑا مسلمانوں کی تعلیمی حالت سدھارنے کی خاطر کوشاں رہے۔ چنانچہ آپ نے پنجاب لیجسلیٹو کونسل میں گورنمنٹ کے محکمۂ تعلیم کے لیے مطالبہ میں تخفیف کی تحریک پر ۱۰ مارچ ۱۹۲۷ء کو جو تقریر فرمائی اس کے اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا:

"جناب عالی! تعلیم کا سوال بہت اہم ہے اور مجھے یہ دیکھ کر بہت مسرت ہوئی کہ جن معزز ممبروں (پنڈت نانک چند اور چودھری افضل حق) نے مجھ سے پہلے تقریریں کی ہیں انہوں نے اس موضوع پر کمال سرگرمی اور ولولے کے ساتھ اظہارِ خیال کیا ہے۔ انہوں نے اس امر پر زور دیا ہے کہ تعلیم ایک مشترک دلچسپی کا معاملہ ہے، یعنی یہ کہ ہندو، مسلمان، سکھ سرمایہ دار اور مزدور سب کا اس معاملہ سے تعلق ہے لیکن انہوں نے اس مسئلہ پر ایک بدیشی حکومت کے نقطۂ نظر سے غور نہیں کیا۔ ایک بے غرض بدیشی حکومت تناقض اصطلاحات ہے۔ اس ملک کی بدیشی حکومت لوگوں کو غیر تعلیم یافتہ رکھنا چاہتی ہے۔ بدیشی حکومت رومن کیتھولک کلیسا کی ایک قسم ہے جو ان تمام ذرائع کو مسدود کرنا چاہتی ہے جس سے عوام میں روشن خیالی پیدا ہو سکے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہم تعلیم پر زرِ کثیر خرچ کرتے ہیں لیکن فائدہ مفقود ہے۔ کیا اس ایوان میں یا اس ایوان سے باہر کوئی شخص اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ عوام الناس کے لیے ہمیں تعلیم کی اشد ضرورت ہے۔ ابتدائی تعلیم، ثانوی تعلیم اور دستکاری سب عوام الناس کی تعلیم کے مختلف پہلو ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک حقیقت واضح ہے اور وہ یہ ہے کہ جبری تعلیم کا فوراً نفاذ کرنا چاہیے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ رپورٹ میں مذکور ہے کہ لڑکوں کی ایک کثیر تعداد پہلی جماعت میں داخل ہوتی لیکن وہ روپیہ جو ان پر خرچ کیا جاتا ہے اس لیے ضائع ہوتا ہے کہ یہ لڑکے اعلیٰ جماعتوں تک نہیں پہنچتے۔ اگر ان لوگوں پر ایک کثیر رقم خرچ کی جاتی ہے تو آپ کا یہ فرض ہے کہ ان کو اعلیٰ جماعتوں تک بھی لے جایا جائے۔ انہیں اعلیٰ جماعتوں میں پڑھنے پر مجبور کرنا چاہیے۔ لہٰذا میں گزارش کرتا ہوں کہ جہاں تک ابتدائی تعلیم کا تعلق ہے اس صوبے کی فلاح و بہبود کے پیشِ نظر جبری طریقۂ تعلیم کا اختیار کرنا بے حد ضروری ہے[۱]۔"

---

[۱] حرفِ اقبال از لطیف احمد شروانی ۱۹۶۱ء صفحہ ۱۸ تا ۴۸

علامہ اقبال تعلیم کو عام کرنے کے ساتھ ساتھ نصابِ تعلیم میں تبدیلی کے زبردست حامی تھے۔اس سلسلے میں انہوں نے عملی اقدام بھی کیا۔ چنانچہ آپ نے حکیم احمد شجاع کے اشتراک سے چھٹی، ساتویں، آٹھویں اور دسویں جماعتوں کے جدید اردو نصاب تیار کیے جو سلسلۂ ادبیہ کے نام سے موسوم ہوئے یہ کتابیں گلاب چند کپور اینڈ سنز بک سیلرز و پبلشرز انارکلی لاہور نے شائع کیں۔دیباچوں میں مروجہ درسی کتابوں میں خامیوں کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ سلسلۂ ادبیہ کی امتیازی خصوصیات بیان کی گئیں۔مثال کے طور پر یہ تحریر تھا:

"اردو کی مروجہ درسی کتابوں میں یہ کمی عام طور پر محسوس کی جاتی ہے کہ وہ نفسِ مضمون، اندازِ تحریر اور طریقۂ انتخاب کے اعتبار سے زمانۂ حال کے مطالبات کو پورا نہیں کرتیں۔۔۔۔۔سلسلۂ ادبیہ کی ترتیب میں اس امر کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہے کہ پرانے اساتذۂ فن کے نتائجِ فکر کے ساتھ ساتھ زمانۂ حال کے ان انشا پردازوں اور شاعروں کے مضامینِ نظم و نثر بھی طالب علم کی نظر سے گزریں جنہوں نے اردو کو ایک ایسی زبان بنانے کے لیے انتھک اور کامیاب کوششیں کی ہیں جو موجودہ ضروریات کے مطابق اور ادائے مطالب پر قادر ہو۔ مضامین کے انتخاب کے تنوع کو مدنظر رکھتے ہوئے اس امر کی کوشش کی گئی ہے کہ ہر مضمون ادبی خوبیاں رکھنے کے باوجود نئی معلومات کا حامل ہو۔"[1]

علامہ اقبالؒ بچوں کی تربیت کے ساتھ ساتھ اساتذہ کی تربیت کے بارے میں بڑے فکر مند تھے۔اساتذۂ کرام جو معمارِ قوم ہوتے ہیں اور جن کے ہاتھوں سے قوموں کی تقدیر بنتی ہے وہ اگر خود ہی زمانہ کی تقلید کرنے لگیں اور روایت پسند بن جائیں تو ان کی اس روش سے تعلیم کا مقصد فوت ہو جاتا ہے ؎

کر سکتے تھے جو اپنے زمانہ کی امامت
وہ کہنہ دماغ اپنے زمانہ کے ہیں پیرو

علامہ اقبالؒ کو اساتذہ سے یہ شکایت ہے کہ وہ بچوں میں شجاعت، دلیری اور اولوالعزمی پیدا کرنے کی بجائے ان کو خاک بازی کا سبق دیتے ہیں۔علامہ اقبالؒ نے اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا ؎

---

[1] انوارِ اقبال از بشیر احمد ڈار، ۱۹۶۷ء، صفحہ ۲۱و۲۲۔

شکایت ہے مجھے یا رب خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

علامہ اقبال دینی اور اخلاقی تعلیم کو بنیادی حیثیت قرار دیتے ہیں۔ اساتذہ بذاتِ خود دین سے بے بہرہ اور بیگانہ ہو گئے اور ان کی تربیت کا اثر یہ ہوا کہ طلباء بھی الحاد و کفر کا شکار ہو گئے اور اساتذہ کی بے توجہی اور بے پروائی نے انہیں بھی دین سے بے بہرہ کر دیا۔ ایسے ہی موقعہ کے پیشِ نظر علامہ اقبالؒ کی دُور رس اور دُور بین نظر اس شعر پر پڑی تھی ؂

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ

سر شیخ عبدالقادر، صدر انجمن حمایت اسلام لاہور، ممبر انڈیا کونسل بن کر لندن چلے گئے تو ان کی جگہ یکم جولائی ۱۹۳۴ء کو علامہ اقبالؒ انجمن کے صدر منتخب ہوئے۔ ۴ر جولائی ۱۹۳۴ء بروز ہفتہ بوقت ساڑھے پانچ بجے شام علامہ اقبال کی صدارت میں جنرل کونسل کا ایک اجلاس منعقد ہوا۔ آپ کی طبیعت کچھ علیل تھی اس لیے آپ تقریر نہ کر سکے۔ آپ کی تحریر شدہ تقریر آزیری سکرٹری نے اراکین جنرل کونسل کے سامنے پیش کی۔ رسمی شکریے کے بعد علامہ اقبال نے تحریر فرمایا:

"اس وقت چند اُمور ہیں جو آپ کی فوری توجہ کے محتاج ہیں:

اوّل۔ دینیات کی تعلیم۔ تجربہ بتاتا ہے کہ جدید تعلیم نے مسلمان نوجوانوں کے اخلاقِ زندگی پر کوئی خاص اثر نہیں کیا اور یہ امر ظاہر ہے کہ ایک مسلمان نوجوان کی تعلیم کی اساس اگر دینی اور اخلاقی نہ ہو تو اس میں سیر چشمی، بلند نظری اور خودداری کے وہ اوصافِ حسنہ نہیں پیدا ہو سکتے جو اسلامی سیرت کے مابہ الامتیاز ہیں۔ اس کے علاوہ یہ ضروری ہے کہ ہر مسلمان تھوڑا بہت اپنی ملی روایات کا حامل ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو قرآنِ کریم کے ارشاد کے مطابق "لتکونوا شھداء علی الناس" کا مقصد کیونکر پورا ہو سکتا ہے۔ . . . اب آپ سے میری استدعا یہ ہے کہ اس معاملے پر کافی غور و خوض کے بعد زمانۂ حال کے مقتضیات کے مطابق انجمن کے کالج اور سکولوں میں دینی اور اخلاقی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔

دوسرا امر جو آپ کی فوری توجہ کا محتاج ہے وہ مسلمان لڑکیوں کی تعلیم ہے۔ مسلمانوں کا

منوسط طبقہ اب کافی بیدار ہو چکا ہے اور اس بات کا مطالبہ کر رہا ہے کہ ان کی اولاد کی صحیح اسلامی اصول کے مطابق تعلیم و تربیت کی جائے ۔ میری ذاتی رائے تو یہ ہے کہ انجمن فی الحال مسلمان لڑکیوں کی تعلیم کے لیے اپنا نصاب تجویز کرے اور مجوزہ نصاب کے مطابق ان کا سالانہ امتحان لے کر خود ہی سندات تقسیم کرے ۔ جہاں تک لڑکیوں کی تعلیم کا تعلق ہے فی الحال آپ صرف ایک امتحان لینے والے ادارے کے طور پر کام شروع کر دیں اور رفتہ رفتہ اسی ادارے کو مسلمان عورتوں کی ایک آزاد یونیورسٹی کی صورت میں منتقل کر دیں بلکہ آپ کا مجوزہ انڈسٹریل گرلز سکول بھی اسی یونیورسٹی کی ایک شاخ قرار پائے ۔"[1]

علامہ اقبالؒ ایک عالمِ نو کی تعمیر کے متمنی تھے ۔ تعمیرِ جدید سے پہلے وہ دلوں کو ایک ایسے علم سے منور کرنا چاہتے تھے جو ان کو خودگر اور خودنگر بنا دے ۔ وہ تعلیم کی مدد سے روحانی اور اخلاقی اور اس کے ساتھ جسمانی ارتقاء کے خواہاں تھے ۔ وہ مادی تعلیم کی نسبت روحانی تعلیم کو بہتر سمجھتے تھے ۔

علم را برتن زنی مارے بود
علم را بر دل زنی یارے بود (مولانا رومؒ)

علامہ اقبالؒ انسان کو عالم بنانے سے پہلے اسے انسان بنانا چاہتے تھے ۔ وہ انسان کو ایک مکمل انسان دیکھنے کے خواہاں تھے ۔ ان کا نظریۂ تعلیم یہ ہے کہ انسان اپنی ہستی کو پہچانے اور اس کی مدد سے خدا کو پہچانے ۔ اپنی خودی کو بیدار کرنا اور اپنی حقیقت کو سمجھنا انسانی ترقی کی معراج ہے ۔ اس زندگیِ ناپائیدار کو ابدیت خودی کی بدولت حاصل ہوتی ہے ۔

نمود جس کی فرازِ خودی سے ہو وہ جمیل
جو ہو نشیب میں پیدا قبیح و نامحبوب

خودی زندگی کو آب و گل کے اس پنجرے سے آزادی دلاتی ہے اور اسرار و رموزِ قدرت آشکارا کرتی ہے اور انسان کو خود آگاہ اور بے نیاز کرتی ہے ۔

خودی ہو زندہ تو ہے فقر بھی شہنشاہی
نہیں ہے سنجر و طغرل سے کم شکوہِ فقیر!

[1] ہفت روزہ "حمایتِ اسلام" لاہور ۔ ۱۹ر جولائی ۱۹۴۴ء صفحہ ۵ ۔

خودی ہو زندہ تو دریائے بیکراں پایاب
خودی ہو زندہ تو کہسار پرنیاں و حریر!

علامہ اقبالؒ خودی کو علم کا سرچشمہ قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک عقل کی غلامی علم کو تنگ نظر بنا دیتی ہے۔ یہ خودی کا فیضان ہے کہ یہ قلب کو تابندگی اور عقل کو فطرت شناسی عطا کرتی ہے ؎

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسمٰعیل کو آدابِ فرزندی

اس سائنسی دور میں علم کی رسائی صرف مادّی اشیاء تک محدود ہے اور اس میں روحانی عنصر غائب ہو گیا ہے۔ اسے علامہ اقبال عشق سے تعبیر کرتے ہیں۔ روحانیت اور مادیّت میں جو خلا پیدا ہوا ہے، علم انسانی خوش حالی میں اضافہ کرنے کی بجائے اس کی تباہی، بربادی اور ہلاکت کا باعث بنا ہے ؎

عشق کی تیغِ جگر دار اڑا لی کس نے
علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی

اور ؎

یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبّر، یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیمِ مساوات

علامہ اقبالؒ کے نزدیک مکمل تعلیم وہی ہو سکتی ہے جس میں علم کی دونوں صورتیں علم عقلی اور علم وجدانی شامل ہوں۔ ان کے نزدیک تعلیم کا مقصد خارجی اور داخلی زندگی دونوں کی تکمیل کرنا ہے۔ علامہ اقبالؒ علم کے ساتھ عشق اور خبر کے ساتھ چشمِ بصیرت کو لازمی قرار دیتے ہیں۔ وہ عقل کے ساتھ دل اور دل کے ساتھ عقل کی رہنمائی ضروری سمجھتے ہیں۔

مرد کی تعلیم کے ساتھ ساتھ علامہ اقبالؒ عورت کی تعلیم کو بہت ضروری جانتے ہیں۔ مسلمان لڑکیوں کی تعلیم کے بارے میں آپ نے کئی مواقع پر اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔ وہ مرد کی طرح عورت کو بھی مغربی تعلیم دلوانے کے حق میں نہیں۔ آپ نے مغربی تعلیم کی اندھا دھند تقلید دیکھ کر فرمایا تھا ؎

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی ڈھونڈ لی قوم نے فلاح کی راہ
روشِ مغربی ہے مدّ نظر وضعِ مشرق کو جانتے ہیں گناہ

یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین؟ پردہ اُٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

علامہ اقبالؒ عورت کو ایسی تعلیم دلوانے کے خواہاں تھے جو اس کو اس کی ذمہ داریوں کے پورا کرنے میں معاونت کر سکے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ مضامین بھی نصاب میں شامل ہوں جو عورت کو معاشرہ کا کارآمد اور فائدہ مند فرد بنا سکیں۔ علامہ اقبال عورت کے لیے ایسی تعلیم کے حق میں بالکل نہیں تھے جس کا اظہار انہوں نے مندرجہ ذیل اشعار میں فرمایا تھا ؎

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت
بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن
ہے عشق و محبّت کے لیے علم و ہُنر موت

علامہ اقبال لڑکیوں کو بھی دینی اور اخلاقی تعلیم دینے کے حق میں تھے۔ وہ نہ تو آج کل کی طرح مخلوط تعلیم کی اجازت دینا چاہتے تھے اور نہ ہی عورت کو مغربی تعلیم دلوانے کے بارے میں سوچ سکتے تھے۔ فقیر سیّد وحیدالدین "روزگارِ فقیر" (حصہ اوّل) میں علامہ اقبالؒ کے عورت کی تعلیم کے بارے میں نظریات و تصوّرات پیش کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"صنفِ نازک کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کا یہ نظریہ تھا کہ خواتین کا کام گھروں میں رہ کر نئی نسل کو تربیت دینا ہے کہ اس طرح معاشرے میں اعتدال و سکون قائم رہ سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب عورت کو "شمعِ انجمن" نہیں "چراغِ خانہ" دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کے سامنے یورپ کی زندگی تھی کہ عورت نے وہاں جب سے گھریلو ذمہ داری: تدبیرِ منزل اور خانہ داری کو خیرباد کہا ہے، یورپ کا معاشرہ تباہ اور ابتر ہو کر رہ گیا ہے اور گھریلو زندگیاں بے مزہ اور بے سکون ہو گئی ہیں —— ایک دن بیگم راس مسعود نے قدرے شکایت کے انداز میں ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ مرد خود تو تفریح کرنے اور دل بہلانے کے لیے رقص و سرود کی محفلوں اور کلب گھروں میں چلے جاتے ہیں، لیکن بیچاری عورتوں کو چار دیواری میں مقید رہنے کا حکم دیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے نہایت ہی متین لہجہ میں کہا: میں جو کچھ کہتا ہوں اس میں تمام تر خواتین کا ہی فائدہ ہے۔ سفرِ افغانستان سے واپسی پر ڈاکٹر صاحب سے مزید دریافت کیا گیا کہ جب قرآن کریم تمام

انسانوں کو علم و آگہی حاصل کرنے کی ہدایت کرتا ہے تو پھر لڑکوں اور لڑکیوں کی جدید تعلیمی سہولتوں پر کیوں قدغن لگائی جاتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اس کے جواب میں فرمایا۔ بے شک قرآن کریم میں حصولِ علم پر بڑا زور دیا گیا ہے لیکن اس میں یہ کہاں کہا گیا ہے کہ لڑکے اور لڑکیاں ایک مکتب میں مل جل کر تعلیم حاصل کریں۔

پردہ اور مخلوط تعلیم کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کے خیالات بڑے واضح تھے اور وہ اپنے اس موقف سے بال برابر ہٹنا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے خود اپنی زندگی میں اس کا عملی ثبوت دیا کہ اپنی بچی منیرہ کی تعلیم و تربیت کے لیے بڑی کوشش اور جدوجہد کے بعد علی گڑھ سے ایک معلّمہ بلوائی جس نے گھر میں رہ کر ڈاکٹر صاحب کی بچی کو تعلیم دی۔

(بقیّہ نقد و نظر)

موجود ہے۔ پھر علامہ اقبالؒ کی دو نظمیں اپنی بے پناہ مقبولیت کے باعث آج بے شمار سکولوں میں بطور دُعا پڑھی جاتی ہیں۔ ان نظموں میں خدا کے تصوّر کو جس طریقے سے پیش کیا گیا ہے ان کے مطالعہ سے حقیقتِ حال کی بڑی اچھی وضاحت ہو جاتی ہے۔ یہ بات ملحوظِ خاطر رہے کہ مجرّد تصوّرات کو ذہن نشین کرنے کی جو ترکیب علامہ اقبالؒ نے یہاں بتائی ہے وہ یہ ہے کہ وہ جس طرح تصوّرات کے لیے مقابلۂ مدرکات کی، تصدیقات کے لیے مقابلۂ تصورات کی ضرورت ہے اُسی طرح استدلال کے لیے جو مقابلہ تصدیقات سے پیدا ہوتا ہے یہ ضروری ہے کہ بچّے کے علم میں کافی تعداد تصدیقات کی ہو۔ اُستاد کو خیال رکھنا چاہیے کہ بچّے کے مُدرکات، تصوّرات، تصدیقات اور استدلالات اُس کے علم کے انداز کے ساتھ ساتھ ترقی کرتے جائیں۔"

(ع۔ ح۔ ص)